ہمارے زمانے کا جامعہ

نسیم احمد غازی فلاحی

ادارہ حیات نو
بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی

©جملہ حقوق محفوظ

کتاب کا نام: ہمارے زمانے کا جامعہ

مصنف: نسیم احمد غازی فلاحی

صفحات: 32

سن اشاعت: 2015ء

تعداد: 2000

قیمت: 20-00/روپے

ناشر: **ادارہ حیات نو**

بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی۔276121

مطبوعہ: نیو پرنٹ سینٹر، دہلی۔٦

ملنے کے دوسرے پتے:

ادارہ علمیہ

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی۔276121

مدھر سندیش سنگم

E-20، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔110025

فون:09212356332, 011-26953327

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلے یہ چند باتیں

ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان بہت ہی گہرا منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ ماضی تجربات کا ایک مجموعہ ہے تو حال اپنے آپ میں ایک تجربہ گاہ اور مستقبل اس سلسلے کا ایک فطری نتیجہ۔

عملی زندگی میں ماضی کا اپنا مقام ہوتا ہے اور حال اور مستقبل کا اپنا مقام۔ ایک کامیاب زندگی کے لیے، خواہ وہ فرد کی ہو یا اجتماعیت کی، اس کا لحاظ از حد ضروری ہے۔ جس طرح ماضی میں الجھ کر رہ جانے والے نہ صرف اپنے مستقبل سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، بلکہ اپنے حال کو بھی مکدر کر ڈالتے ہیں، اسی طرح ماضی سے بے نیاز مستقبل کی طرف پیش رفت کرنے والے نہ صرف ماضی کے اہم اور مفید تجربات نیز بعض اہم معلومات سے محروم رہ جاتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ان راہوں پر نکل جاتے ہیں، جو انہیں منزل سے دُور کرتی چلی جاتی ہیں۔

فرد کے تناظر میں بھی یہ بات اہم ہے اور اجتماعیت کے تناظر میں بھی، لیکن اجتماعیت کے تناظر میں اس کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اجتماعی اداروں میں مختلف مزاج اور سوچ رکھنے والے افراد ہوتے ہیں اور افراد کی تبدیلی کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ان اجتماعی اداروں پر بھی رونما ہوتے ہیں۔ اس سے جہاں یہ امید ہوتی ہے کہ خوب سے خوب تر کی طرف پیش رفت ہوگی، وہیں یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ سمت سفر کہیں متاثر نہ ہوجائے۔

''حیات نو'' کی ادارت کے اوّل روز سے یہ خیال ذہن میں رہا کہ اس مجلّہ کے ذریعے جامعۃ الفلاح کے ابتدائی دور کی حسین یادوں اور مفید تجربات کو سامنے لایا جائے، حال کے لیے رہنما خطوط پیش کیے جائیں اور اس طرح ایک روشن مستقبل کی جانب مثبت اور تعمیری پیش

رفت کی بنیاد ڈالی جائے۔

'ہمارے زمانے کا جامعہ'اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس کا آغاز اکتوبر ۲۰۱۳ء میں کیا گیا۔ یہ حیات نو کا ایک مستقل کالم ہے، جس کے آغاز میں مذکور ادارتی نوٹ اس کے مقصد کی جانب بہت ہی واضح طور سے رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں درج ہے:

''ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی''۔

اس کالم کے تحت ہر بیچ کے کم از کم ایک فرد کی نمائندگی طے کی گئی تھی اور یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ اس سلسلے کے مکمل ہوجانے پر اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ تاہم اپریل تا جون ۲۰۱۵ء میں جب اس کالم کے تحت مولانا نسیم احمد غازی فلاحی کی مؤثر اور وقیع تحریر شائع ہوئی تو فلاحی برادران اور قارئین حیات نو کی جانب سے یہ احساس بہت ہی شدت کے ساتھ سامنے آیا کہ اس تحریر کو فوری طور پر کتابچے کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ اس کی افادیت زیادہ سے زیادہ عام ہوسکے۔ چنانچہ ادارہ نے اس کی فوری اشاعت کا فیصلہ کیا، موصوف سے رابطہ کیا گیا، انہوں نے اس میں مزید کچھ اضافوں پر موافقت ظاہر کی، اور الحمدللہ اب یہ تحریر کتابچے کی صورت میں منظر عام پر آرہی ہے۔

مولانا نسیم احمد غازی فلاحی جامعہ کے ابتدائی دور کے فارغین میں، بلکہ ان چند نمایاں فارغین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے جامعہ اور تحریک اسلامی کے بلند ترین مقاصد کے حصول کے لیے اپنی زندگی وقف کردی اور آج بھی الحمدللہ اسی عزم وحوصلے کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں نظر آتے ہیں۔

موصوف کی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں، ایک عملی دنیا سے متعلق ہے اور دوسرا علمی وفکری دنیا سے۔ ایک طرف دعوت دین کے لیے زبردست عملی جدوجہد ہے، دوسری طرف اس کام کے لیے منظّم اور منصوبہ بند طریقے سے علمی وفکری تیاری کا کام ہے۔

برادران وطن کے درمیان دعوتی کام، اسلامی ساہتیہ ٹرسٹ اور مدھر سندیش سنگم کے تحت

دعوتی لٹریچر کی تیاری اور مولانا مودودیؒ کی مایہ ناز تفسیر تفہیم القرآن کا ہندی ترجمہ آپ کی کتابِ زندگی کے نمایاں ابواب ہیں۔ آپ جامعۃ الفلاح کی مجلس شوری کے بنیادی رکن بھی ہیں۔

موصوف کی تحریریں مختلف پہلوؤں سے اپنے اندر انفرادیت رکھتی ہیں۔ ان تحریروں میں آسان اسلوب، عام فہم گفتگو اور عملی رنگ نمایاں ہوتا ہے، جس سے ان کی تاثیر اور افادیت دوبالا ہوجاتی ہے۔ زیرنظر کتابچے میں بھی یہ انفرادیت بہت ہی واضح طور سے نظر آتی ہے۔

ادارہ حیات نو اس موقع پر مولانا نسیم احمد غازی فلاحی کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے کہ ان کی شفقت ومحبت اور گراں قدر توجہات ادارے کے لیے بہت ہی قیمتی سرمایہ ہیں۔ اسی طرح اس موقع پر جناب نعیم احمد غازی فلاحی اور ڈاکٹر محی الدین غازی نیز دیگر احباب وبزرگوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جن کی مستقل توجہ اور رہنمائی نے حیات نو کی افادیت اور حلقہ اثر بڑھانے میں غیر معمولی تعاون کیا، فجزاھم اللہ خیرا۔

ابوالاعلی سید سبحانی

مدیر حیات نو

باسمہ تعالیٰ

ہمارے زمانے کا جامعہ

26/ **جنوری** 1966ء کی صبح محترم مولانا جلیل احسن ندویؒ کے ہمراہ میں جامعۃ الفلاح پہنچا۔ اس وقت میری عمر تقریباً 16/سال تھی۔ میرا وطن دہلی سے متصل یوپی کا مشہور ومعروف صنعتی شہر غازی آباد تھا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ! اس رب کریم کے خاص فضل وکرم سے مجھے نعمت ہدایت حاصل ہوئی۔ میرا تعلق اگروال خاندان سے تھا۔ ہدایت کی یہ دولت مجھے جماعت اسلامی ہند سے وابستہ افراد کے ذریعے نصیب ہوئی۔ میرے والد پہلے ہی انتقال کر چکے تھے، جبکہ میری عمر صرف نو سال تھی۔ میرے گھر میں میری والدہ، بڑے بھائی، ان کے بیوی بچے اور بہنیں تھیں۔ میرے بڑے بھائی اسلام کے بارے میں میرے ہم خیال تھے لیکن اپنی سرکاری ملازمت اور بعض دیگر مصلحتوں کی وجہ سے دین حق کو عملاً قبول کرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ گھر کے بقیہ افراد اسلام مخالف ہی تھے۔ (الحمدللہ! چند سالوں کے بعد یہ سبھی لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔) میں اس وقت ایک کالج میں زیر تعلیم تھا اور اب میں نے اس تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا، اور اپنا گھر اور وطن چھوڑ کر مولانا سید حامد علیؒ کے گھر میران پور کٹرہ ضلع شاہجہانپور یوپی میں رہ رہا تھا۔ اس سے قبل چند دن ضلع میرٹھ یوپی کے کئی مقامات پر بھی رہا۔ مولانا مرحوم نے دینی تعلیم کے لیے مجھے جامعۃ الفلاح بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جب مولانا نے مجھے اس بارے میں بتایا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ علم حاصل کرنا شاید میری قسمت میں نہیں ہے، اس لیے آپ میرے لیے کوئی کام دھندے کے بارے میں سوچیے۔ دراصل ہمارے خاندانی پنڈت جی نے میری پیدائش کے بعد میرے بارے میں بتایا تھا کہ اس بچے کی قسمت میں تعلیم حاصل کرنا نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں اس بات کا تذکرہ کر کے مجھ پر لعن طعن بھی ہوتی

رہتی تھی، چنانچہ میرے تحت الشعور میں بھی یہ بات بیٹھ چکی تھی۔ اور اسی لیے میرا تعلیم میں کبھی دل نہیں لگا اور میں ایک آدھ بار فیل بھی ہوا۔

مولانا سید حامد علی صاحبؒ نے مجھے یقین دلایا کہ میری قسمت میں تعلیم حاصل کرنا ہے اور پنڈت جی کی بات درست نہیں ہے۔ غیب کا علم صرف خدا کو ہے۔ مولانا نے مجھے کئی شخصیات کے بارے میں بتایا کہ وہ کس طرح ناکام ہونے کے بعد مسلسل کوشش کے نتیجے میں کامیابی سے ہم کنار ہوئیں۔ مولانا کے سمجھانے بجھانے سے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا اور اس مقصد کے لیے جامعۃ الفلاح پہنچ گیا۔ میرا جامعۃ الفلاح جانا میرے اور میرے خاندان کے لیے باعث رحمت ثابت ہوا، جیسا کہ بعد کے حالات سے سامنے آیا۔

ان دنوں رمضان المبارک کی تعطیل میں مولانا جلیل احسن ندویؒ بریلی (یوپی) آئے ہوئے تھے اور رمضان کے فوراً بعد ان کی واپسی تھی۔ چنانچہ مولانا سید حامد علی صاحب مرحوم نے مجھے بریلی آسنسول پسنجر ٹرین میں مولانا جلیل احسن مرحوم سے یہ کہتے ہوئے ان کے حوالے کردیا کہ اللہ کی سرپرستی کے بعد اب یہ آپ کی سرپرستی میں ہے۔ مولانا مرحوم نے مجھے مولانا جلیل احسن ندوی صاحبؒ کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ بتا دیا تھا یعنی یہ کہ وہ بہت بڑے عالم ہیں اور جامعۃ الفلاح کے سرپرست استاذ ہیں۔

ٹرین روانہ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ مولانا ندویؒ ہاتھ اور پیروں سے معذور ہیں، ان کا صرف بایاں ہاتھ ہی کام کرتا ہے۔ مولانا کی ظاہری شخصیت کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ صاحب بڑے عالم اور استاذ الاساتذہ ہوں۔ ان کا تو طلبہ اور اساتذہ مذاق بناتے اور ان کی کھلی اڑاتے ہوں گے۔ طلبہ کا ایسے شخص سے تعلیم حاصل کرنے اور اس کا احترام کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے مشاہدات اور تجربات کی دنیا بہت محدود تھی اور میں نے اب تک اسکول اور کالج کا ماحول ہی دیکھا تھا، اسی کے پیش نظر میں نے یہ رائے قائم کی۔ راستے میں مولانا ندویؒ نے مجھ سے کوئی خاص بات چیت نہیں کی، بس میری ضروریات کا خیال رکھا اور راستے بھر کچھ نہ کچھ کھلاتے پلاتے رہے۔ رات چار بجے شاہ گنج اسٹیشن پر اتر کر ہم چھوٹی لائن ٹرین میں اعظم گڑھ کے لیے سوار ہوگئے۔ صبح چھ ساڑے چھ بجے

یہ ٹرین اعظم گڑھ پہنچ گئی۔ جسمانی طور پر اس قدر معذور ہونے کے باوجود مولانا بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ ٹرین سے نیچے اترے۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر مولانا نے دو رکشے کرایے پر لیے، ایک پر خود سوار ہوگئے اور دوسرے پر مجھے سوار کردیا۔ مولانا کا رکشہ آگے آگے اور میرا ان کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ اعظم گڑھ شہر سے گزرتے ہوئے ہم بلریا کی چنگی کے راستے بلریا گنج کی سڑک پر آگئے۔ سڑک کیا تھی، کنکر پتھر کا ایک اوبڑ کھابڑ راستہ تھا، جس پر صرف اکا دکا رکشہ یا یکہ چلتے تھے۔ یہ یکے بھی بڑے خطرناک قسم کے تھے، یعنی ان پر ایک سپاٹ تختہ فٹ ہوتا تھا اور سواریوں کے پکڑنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ نہیں معلوم کہ ان پر لوگ کس طرح بیٹھ کر سفر کرلیا کرتے تھے۔ اس وقت کوئی بس یا ٹیکسی وغیرہ نہیں چلتی تھی۔ چونکہ ہم لوگ رکشے پر سوار تھے اس لیے میں سمجھ رہا تھا کہ قریب ہی کوئی جگہ ہوگی جہاں ہمیں جانا ہے۔ راستے میں جب بھی کوئی آبادی یا عمارت نظر آتی تو میں سمجھتا کہ شاید یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔ مگر رکشہ آگے بڑھ جاتا۔ وہاں کے رکشے والے قابل داد تھے کہ اس قدر خراب سڑک اور لمبا راستہ، مگر وہ رکشے کی سیٹ پر بیٹھ کر بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رکشہ چلا رہے تھے۔ معاملہ پیٹ کا تھا، اس لیے ان کو یہ مشقت برداشت کرنی ہی تھی۔ رکشے پر سوار ہم لوگ بھی تھوڑی بہت داد کے مستحق ضرور تھے کہ اتنا لمبا راستہ اس صبر واستقلال کے ساتھ طے کررہے تھے، وہ بھی مولانا ندویؒ جیسے معذور شخص۔ رکشہ خراماں خراماں چلتا رہا اور تیرہ چودہ کلومیٹر کا راستہ طے کرنے کے بعد ہماری منزل آگئی۔ اس وقت جامعۃ الفلاح کی نہ تو چہار دیواری تھی اور نہ کوئی گیٹ۔ جامعۃ الفلاح کے سامنے مشرق کی جانب ایک پختہ عمارت تھی جو دراصل سرکاری بلاک کی تھی۔ جامعۃ الفلاح کی اصل عمارت سڑک سے مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع تھی۔ اس سے پہلے کچھ کھیت تھے۔ رکشہ جامعہ کی طرف کچی سڑک پر مڑ گیا۔ جامعہ کے کھلنے میں ابھی چند دن باقی تھے، البتہ کچھ طلبہ وہاں موجود تھے جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ مولانا کے رکشے کو آتا دیکھ کر ان طلبہ نے زور زور سے ایک دوسرے کو پکارنا شروع کیا، ''مولانا آگئے، مولانا آگئے''، اور یہ کہتے ہوئے وہ طلبہ مولانا کی طرف دوڑ پڑے۔ گویا وہ مولانا کا بے قراری کے ساتھ انتظار کررہے تھے۔ پھر وہ لوگ مولانا کے رکشے کے ارد گرد رکشے پر ہاتھ رکھ کر ساتھ

ساتھ چلتے رہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی شاہی سواری جا رہی ہے اور رکشے پر دلوں کا کوئی شہنشاہ سوار ہے۔ مولانا کی رہائش گاہ مغرب کی جانب عمارت (مودودی منزل) میں تھی۔ وہاں پہنچ کر رکشے سے سامان اتارا گیا اور مولانا کو ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مولانا کا یہ کمرہ کافی کشادہ تھا جو ان کی قیام گاہ بھی تھا، ان کا کلاس روم اور ان کی لائبریری بھی۔ اس کے ایک گوشے میں چائے وغیرہ بنانے کا انتظام تھا۔ چند منٹ میں ان طلبہ نے مولانا کے کمرے کی صفائی کر دی اور مولانا کے لیے چائے تیار کر دی۔ لولے لنگڑے مولانا سے طلبہ کا یہ والہانہ لگاؤ اور ان کے احترام کا یہ منظر دیکھ کر میں بہت متأثر ہوا۔ میں نے سمجھ لیا کہ جس درسگاہ میں مجھے حصول علم کے لیے بھیجا گیا ہے، یہ اس طرح کی تعلیم گاہ نہیں ہے جو اب تک میں نے دیکھی ہے۔ یہ تو کوئی دوسری ہی دنیا ہے، جس کا تصور بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ نہیں کر سکتے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اللہ مجھے ایک اچھی جگہ لے آیا ہے۔ مجھے اللہ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ میرے حق میں بہتر فیصلہ ہی فرمائے گا۔ ابھی درس گاہ کھلنے میں کئی دن باقی تھے، اس لیے مجھے قریب ہی ایک کمرے میں ٹھہرا دیا گیا۔

اگلے روز صبح کے وقت ایک صاحب چھریرہ بدن، براؤن رنگ کی شیروانی زیب تن کیے، ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے تشریف لائے۔ وہ کافی چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے سرسری سی ایک نگاہ جامعہ کے چاروں طرف ڈالی اور پھر مولانا جلیل احسن ندوی صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہ جامعہ کے صدر مولانا عبدالحسیب اصلاحی مدظلہ تھے۔ مولانا ندوی سے ملاقات کے بعد وہ میرے پاس تشریف لائے۔ میرے بارے میں انہیں پہلے سے مطلع کر دیا گیا تھا اور مولانا ندویؒ نے بھی انہیں بتا دیا تھا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے مجھ سے مصافحہ کیا، حال چال دریافت کیا اور بڑی محبت سے فرمایا کہ آپ کو کسی طرح کی کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ان کی بازار میں فلاں دوکان ہے۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہو وہاں جا کر (بلا قیمت) لے لیا کروں۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے۔ اس کوٹھری نما کمرے میں جانے کے لیے بڑے سے بڑے آدمی کو سر جھکا کر جانا پڑتا تھا (اس لیے کہ اس کا

دروازہ بہت چھوٹا تھا)۔ اس چھوٹے سے کمرے کے ایک گوشے میں چارپائی، کتابوں کی الماری اور ایک کونے میں چائے وغیرہ بنانے کا انتظام تھا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے چھڑی ایک طرف رکھی، شیروانی اتاری، اور چائے بنانے کے لیے اسٹو وجلانے لگے۔ مجھے اپنے پاس فرش پر ہی بٹھا لیا۔ میں نے چائے بنانے کی پیشکش کی تو بڑے پیار سے فرمایا،نہیں بچہ نہیں! انہوں نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور پھر ایک پیالی چائے میری طرف بڑھا دی، ساتھ میں گلوکوز کے بسکٹ بھی سامنے رکھ دیے۔ چائے پینے کے بعد میں نے بڑھ کر برتن دھونے چاہے مگر مولانا نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا بلکہ خود ہی برتنوں کی صفائی کی۔ میرے لیے یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ جامعہ کا پرنسپل اور اس کے اندر اتنی خاکساری اور طلبہ سے اس قدر محبت! میرے لیے یہ بالکل نئی اور حیرت انگیز بات تھی۔

میرے کمرے کے سامنے توت کا ایک درخت تھا۔ میں اس کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ جامعہ کے ہیڈ باورچی 'ناصر صاحب' آئے اور مجھ سے پوچھا کہ مولی صاب (مولوی صاحب) آپ کس درجے میں داخلہ لیں گے (واضح رہے کہ بستی میں جامعہ کے ہر طالب علم اور اُستاذ کو 'مولی صاب' کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔) میں نے انہیں بتایا کہ مجھے اردو نہیں آتی ہے اس لیے نیچے کسی درجے میں پڑھوں گا۔ وہ برجستہ بولے؛ تب تو آپ کے ساتھ بہت چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے۔ میں ناصر صاحب کی یہ بات سن کر پریشان ہوگیا اور میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اگلے روز ایک صاحب دراز قد، دیو قامت، سفید رنگ کا لمبا کرتا، سر پر کپڑے کی ٹوپی، نصف ساق تک لنگی اور پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں (کھٹپٹی) پہنے جامعہ تشریف لائے۔ انہیں آتا دیکھ کر بہت سے طلبہ ان کے استقبال کے لیے لپکے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ مولانا شہباز اصلاحی صاحب ہیں جو جامعہ کے استاذ اور مربی ہیں۔ انگلش، ہندی، اردو، عربی اور فارسی تمام زبانوں کے ماہر، بہترین مقرر و مصنف ہیں۔ ان کی شخصیت گوناگوں اور ہمہ جہتی اوصاف کی مالک ہے۔ مولانا شہباز صاحبؒ کو بھی میرے بارے میں معلوم ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرے حالات و کوائف معلوم کیے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ میں نے ہندی

میڈیم سے مڈل پاس کیا ہے، اردو برائے نام جانتا ہوں، اس صورت میں میرا داخلہ عربی اول میں تو ہو نہیں سکتا۔ مجھے تو مکتب میں چھوٹے بچوں کے ساتھ پڑھنا ہوگا۔ مولانا نے میری بے چینی اور نفسیاتی کیفیت کو بھانپ لیا اور فیصلہ کن انداز میں فرمایا کہ تم کو مکتب میں پڑھنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ جب اردو میڈیم کے طلبہ عربی اول میں پڑھ سکتے ہیں تو پھر ہندی میڈیم کا طالب علم کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ مولانا کا یہ جواب ایک ماہر نفسیات کا جواب تھا، اور شاید اس حدیث پاک کی روشنی میں تھا، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم آسانی پیدا کرو، مشکل پیدا نہ کرو، خوشخبری سناؤ (حوصلے بڑھانے کی بات کرو) نفرت نہ دلاؤ (مایوس نہ کرو)''۔ چنانچہ مولانا کی اس حوصلہ افزائی سے یقیناً مجھے بڑی راحت اور تقویت ملی۔

اب جامعہ کھل چکا تھا۔ داخلے شروع ہو چکے تھے۔ نئے اور پرانے طلبہ کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ میں نے ایک خاص بات یہ دیکھی کہ جب بھی کوئی سواری جامعہ کے سامنے سڑک پر رُکتی اور اس میں سے جامعہ آنے والے طلبہ اور ان کے سرپرست یا کوئی استاذ اُترتے تو طلبہ ازخود اس طرف دوڑ پڑتے اور ان کا سامان لانے میں ان کی مدد کرتے۔ یہ سب باتیں اور دلکش ماحول مجھے اندر ہی اندر جامعہ کا گرویدہ بنا رہا تھا۔

میرے سلسلے میں ذمہ داران جامعہ نے غور کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے بروقت کسی درجہ میں داخل نہ کیا جائے بلکہ ایک سال اردو پڑھا دی جائے اور پھر اگلے سال عربی اول میں داخل کر لیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے درجہ اعدادیہ کے نام سے ایک درجہ قائم کر دیا گیا جس میں میں اکیلا طالب علم تھا۔ اور مجھ ہی سے درجہ اعدادیہ کی ابتدا ہوئی۔

ذمہ داران جامعہ نے میرے لیے درجہ اعدادیہ قائم کرنے کا فیصلہ تو کر لیا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ ایک طالب علم کے لیے استاذ کا تقرر کس طرح کیا جائے۔ اس زمانے میں جامعہ کے مالی حالات بھی اچھے نہ تھے۔ میں نے ذمہ داران (مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور مولانا شہباز صاحب) سے عرض کیا کہ استاذ کے لیے آپ فکرمند نہ ہوں۔ استاذ کا نظم میں خود کر لوں گا۔ ان حضرات نے حیرت سے پوچھا کہ تم یہ نظم کس طرح کرو گے؟ میں نے نہایت ادب کے ساتھ انہیں یقین دلایا کہ ان شاء اللہ دو تین دنوں میں یہ نظم ہو جائے گا۔ میں

نے عرض کیا کہ آپ میرے لیے نصاب تیار کر دیں کہ مجھے کون کون سی کتابیں پڑھنی ہیں۔ چنانچہ مولانا شہباز صاحب نے اگلے روز نصاب بنا کر مجھے دے دیا۔ اس میں دینیات، ہماری کتاب اور سچا دین قابل ذکر ہیں۔

میں نے دفتر تعلیمات سے شعبہ عربی کے اساتذہ کی گھنٹیوں کا چارٹ حاصل کر کے اس میں یہ دیکھا کہ کس استاذ کی کون سی گھنٹی خالی ہے اور پھر اس گھنٹی میں ان کے کمرے میں جا کر ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنی خالی گھنٹی میں فلاں کتاب پڑھا دیا کریں۔ پہلے تو ان حضرات نے عذرات پیش کیے، لیکن میرے شدید اصرار اور شوق کو دیکھ کر وہ سبھی لوگ رضا مند ہو گئے۔ اس طرح میری تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان اساتذہ میں جو مجھے اپنی خالی گھنٹیوں میں پڑھانے پر آمادہ ہو گئے، مولانا شہباز اصلاحیؒ، مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ اور انگلش کے استاذ ماسٹر افضال مشہدیؒ قابل ذکر ہیں۔ میں ان اساتذہ کی خالی گھنٹیوں میں ان کے کمروں میں جا کر پڑھتا تھا۔ دینیات کے لیے میں نے ثانوی کی دینیات کی کلاس میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ یہ کلاس ماسٹر عبدالمجید صاحب کی تھی جو مقامی بستی بلریا گنج ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد عصر اور بعد عشاء اپنے سینئر ساتھیوں سے استفادہ شروع کر دیا۔ اس طرح تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب مرحوم خوش خطی بھی سکھاتے تھے۔

اس زمانے میں مقیم طلبہ کے لیے دو ہوسٹل تھے۔ ایک مغرب میں مودودی منزل اور دوسرا دکھن میں حسن البنا منزل۔ مجھے مودودی منزل میں بڑے طلبہ کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ کمرے کے سبھی بڑے بھائی میرا بہت خیال رکھتے۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ میرا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے اور میں اپنے گھر اور وطن کو خیر آباد کہہ کر یہاں آیا ہوں، چنانچہ وہ لوگ چپکے سے کچھ رقم میرے کوٹ یا قمیص کی جیب میں رکھ دیتے اور جب میں ان لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ اندر ہی اندر مسکراتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کرتے اور کہتے کہ اللہ میاں نے رکھ دیے ہوں گے۔ جامعہ کے پیارے اساتذہ، مجلس انتظامیہ کے معزز ممبران اور بڑے طلبہ ساتھیوں سے مجھے جو محبت اور پریم ملا اس نے مجھے جامعہ کا دلدادہ بنا دیا۔ اُدھر بستی بلریا گنج کی معروف شخصیت حکیم محمد ایوبؒ بھی، جو جامعہ کی مجلس شوریٰ کے بنیادی رُکن اور جماعت کے

امیر مقامی تھے، میرا بڑا خیال رکھتے۔ انہوں نے میری چار پائی اور بستر وغیرہ کا نظم فرما دیا۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ محترم حکیم صاحب جامعہ کے تمام طلبہ و اساتذہ کا علاج مفت کرتے تھے، اور ان کے اصرار کے باوجود کوئی پیسہ نہیں لیتے تھے۔ یہ بڑی بات تھی۔ ایک بار ایک بیرونی طالب علم کے سر پرست اپنے بچے کے علاج کے لیے حکیم صاحب کے مطب پر آئے اور ان کو دوا کے پیسے دینے پر مصر ہو گئے۔ کہنے لگے کہ حکیم صاحب اگر آپ دوا کے پیسے نہیں لیں گے تو ہم علاج نہیں کرا سکیں گے۔ اس پر حکیم صاحب نے صاف طور پر کہا کہ میں جامعہ کا خادم ہوں اور جامعہ کے طلبہ سے دوا کے پیسے نہ لینے کا میں نے اصول بنایا ہے۔ اس لیے میں آپ سے دوا کے پیسے نہیں لے سکتا۔ آپ چاہیں تو اپنے بچے کا علاج کسی دوسرے ڈاکٹر سے کرا سکتے ہیں۔ جامعہ کے قیام، تعمیر و ترقی اور استحکام میں جناب حکیم صاحب کا نہایت اہم رول ہے۔ وہ بہت سے طلبہ اور اساتذہ کا مالی تعاون کرتے۔ اس کی تفصیل کے لیے علاحدہ سے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں جامعہ کے لیے ان کی مزید ایک خدمت کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جامعہ کے قیام کے ابتدائی دنوں میں انگریزی کے استاذ ماسٹر افضال مشہدی صاحب نے اپنی خدمات جامعہ کو پیش کیں۔ ماسٹر صاحب ضلع بستی (یوپی) کے رہنے والے تھے اور گورکھپور (یوپی) میں مقیم تھے۔ وہ جامعہ کے نظام طعام سے مطمئن نہیں تھے۔ محترم حکیم صاحب نے اس خیال سے کہ ایک قابل انگریزی استاذ کی خدمات جامعہ کو میسر رہیں، انہیں اپنے یہاں قیام و طعام کی پیشکش فرمائی، اور پھر ایک طویل عرصے تک اس کو بحسن وخوبی نبھایا۔ حکیم صاحب کی یہ خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اور ان کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوں گی، ان شاء اللہ! (اللہ تعالی نے حکیم صاحب کے اس جذبے کو قبول فرمالیا اور انہیں اس دنیا ہی میں عزت، دولت اور نیک شہرت سے سرفراز فرمایا۔ رب کریم انہیں جنت میں اعلی مقام عطا کرے!)۔

ابھی میری تعلیم کو شروع ہوئے چند ہی ماہ ہوئے تھے اور میری تعلیم بحسن وخوبی جاری تھی کہ محاورے کے مطابق سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ حکومت کے انٹلی جنس محکمے کا ایک آفیسر جامعۃ الفلاح آیا اور اس نے ناظم جامعہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب سے میرے بارے میں

دریافت کیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے جامعہ میں میری موجودگی کے بارے میں اسے بتایا تو اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا نابالغ ہے اور اس کا جامعہ میں پڑھنا مناسب نہیں۔ آپ اسے فوراً اس کے گھر روانہ کردیں، ورنہ جامعہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ میرے گھر کے کسی فرد نے میرے متعلق کوئی شکایت پولیس میں نہیں کی تھی، اس لیے ازروئے قانون حکومت جامعہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی مجاز نہ تھی، لیکن معاملہ قانون کا نہیں، زورزبردستی اور دھاندھلی کا تھا۔ ناظم صاحب نے ذمہ دار اساتذہ سے مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے جامعہ چھوڑ دینا چاہیے اور اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔ میں اس فیصلے سے پریشان ہوگیا اور میں نے جامعہ چھوڑنے سے صاف انکار کردیا۔ جامعہ نہ چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے یہاں جو پیار اور تعاون ملا تھا اس سے میں بےحد متأثر تھا۔ میں نے پڑھا تھا کہ حضرت زیدؓ جو کہ نبیؐ کے غلام تھے جب ان کے والد اور چچا انہیں واپس لے جانے کے لیے مکہ آئے تو زیدؓ نے نبیؐ کو چھوڑ کر اپنے والد کے ساتھ جانے سے صاف منع کردیا۔ یہی کیفیت اس وقت میری تھی، کیونکہ پیروانِ رسول کریمؐ نے مجھے جو پیار اور محبت دی تھی، میں اس سے بہت متأثر تھا، نیز میری تعلیم اور میرے مستقبل کا بھی مسئلہ تھا۔

میں نے حکیم ایوب صاحب سے مل کر انہیں صورت حال سے واقف کرایا اور اپنی اس خواہش اور ضرورت کا اظہار کیا کہ مجھے یہاں سے جانے کے لیے نہ کہا جائے، تاکہ میں اپنی تعلیم مکمل کرسکوں۔ انہوں نے میری بات سن کر پرجوش اور دوٹوک انداز میں فرمایا: ’’آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اگر جامعہ آپ کو اپنے یہاں رکھنے پر تیار نہیں تو آپ میرے گھر پر رہیں گے۔ حکومت کو اگر کوئی کارروائی کرنی ہے تو میرے خلاف کرے۔‘‘ جب حکیم صاحب کی اس بات کا ذمہ داران جامعہ کو علم ہوا تو وہ پھر ایک بار غوروخوض کے لیے جمع ہوئے۔ اس مجلس میں محترم حکیم صاحب بھی شریک تھے۔ آخرکار مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ کچھ دنوں کے لیے مجھے گھر بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ناظم جامعہ محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب میرے پاس تشریف لائے اور بڑی محبت سے مجھے سمجھایا اور مجھ سے فرمایا کہ کچھ دنوں کے لیے آپ اپنے وطن چلے جائیں۔ کچھ دنوں کے بعد آپ جامعہ واپس آجایئے گا۔ جامعہ

آپ کا گھر ہے۔ اور پھر بادل ناخواستہ میں اپنے گھر جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ راستے کے لیے حکیم صاحب نے اپنے گھر سے کھانا تیار کرا کے میرے ساتھ کیا نیز جامعہ کے انگریزی کے استاذ ماسٹر افضال مشہدی صاحب کو مجھے شاہ گنج ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے میرے ساتھ بھیجا۔

اس وقت میرا اپنے وطن آنا بہت مفید رہا۔ اس لیے کہ میرے وطن سے چلے جانے کے بعد یہاں غیر مسلموں میں بڑی بے چینی تھی اور ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر طرف میرے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر میرے ان ''کرم فرماؤں'' نے راحت کی سانس لی۔ حالات کچھ نارمل ہوئے تو میں دوبارہ جامعہ آ گیا۔ اس بار میرے بڑے بھائی نے جو میرے سرپرست بھی تھے جامعہ کے نام ایک تحریر میرے داخلے کے سلسلے میں لکھ کر دے دی تاکہ جامعہ کی قانونی پوزیشن مضبوط رہے۔ اب پھر سے میری تعلیم حسب سابق شروع ہو گئی۔ پروگرام کے مطابق ایک سال کے بعد میرا داخلہ عربی اول میں ہو گیا۔

اس زمانے میں بہار وغیرہ میں زبردست قحط پڑا تھا جس کی وجہ سے جامعہ کی مالی حالت بھی بڑی خستہ تھی۔ کھانے کی چیزوں کی بھی قلت تھی۔ کھانا بہت معمولی اور نپا تلا ملتا تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اِس وقت جامعہ کے کھانے کا معیار اُس وقت کے مقابلے میں بہت اچھا ہے، لیکن ہم طلبہ نے کھانے کے گھٹیا معیار کو کبھی اپنی تعلیم و تربیت میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ میں چھٹیوں میں اپنے وطن جاتا تو دیکھتا کہ میری (غیر مسلم) والدہ میرے لیے بہت فکرمند ہیں۔ وہ میرے کھانے کے بارے میں بھی دریافت کرتیں۔ میں سوچتا کہ اگر ان کو صحیح صورت حال بتا دی گئی تو وہ اور زیادہ پریشان ہو جائیں گی اور ممکن ہے مجھے جامعہ نہ جانے دیں۔ اس لیے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اور اس خیال سے کہ میرا تعلیمی سلسلہ متأثر نہ ہو جائے، میں اپنی والدہ سے کہتا کہ جامعہ میں کھانا نہایت عمدہ ملتا ہے۔ صبح ناشتے میں اصلی گھی کا حلوہ، دودھ اور انڈا ملتا ہے۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں سبزی، بکرے کا گوشت، روٹی اور دال چاول ہوتا ہے۔ عصر کے بعد پھل اور سوتے وقت ایک گلاس گرم دودھ پینے کو ملتا ہے (ہمارے گھر پر رات میں دودھ پینے کا معمول تھا)۔ یہ سن کر میری والدہ کو قدرے اطمینان

ہوتا۔ وہ خیال کرتیں کہ چلو اسے وہاں گھر کی بہ نسبت اچھا کھانا ملتا ہے۔ مگر دو تین سال کے بعد ان پر یہ راز اس وقت فاش ہو گیا جب میرے بھتیجے جامعہ آ گئے۔

بعض سینئر اساتذہ کا خیال تھا کہ طلبہ کو پوری یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کرنے میں لگنا چاہیے اور جماعت کے پروگراموں میں عملی حصہ لینے سے پرہیز کرنا چاہیے مگر بعض دیگر اساتذہ کا خیال تھا کہ طلبہ کو جماعت کے پروگراموں میں شرکت کرنی چاہیے تا کہ ان کی عملی تربیت بھی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہوتی رہے۔ خاص طور پر مولانا شہباز صاحبؒ ہمیں جماعت کے پروگراموں میں شرکت پر ابھارتے۔ جمعہ کے دن طلبہ کے مختلف گروپ بنا کر آس پاس کے دیہاتوں میں بھیجا جاتا، تا کہ وہاں جمعہ میں تقریر اور لوگوں سے ملاقات کر سکیں۔ ضلعی اجتماعات میں بھی طلبہ شرکت کرتے۔ اس میں جامعہ کی جانب سے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ بلریا گنج بستی میں جماعت کی طرف سے ہر ہفتے جمعہ کے دن صفائی کی مہم چلائی جاتی تھی۔ جامعہ کے طلبہ بھی رضا کارانہ طور پر اس مہم میں شریک ہوتے اور بستی کی گلیوں اور نالیوں کی صفائی کرتے۔ بستی کی ہر دل عزیز اور محترم شخصیت حکیم ایوب صاحب امیر مقامی تھے۔ وہ بھی دیگر رفقاء کے ساتھ اس مہم میں شریک ہوتے۔ غیر مسلم محلے میں جب حکیم صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ صفائی کے لیے پہنچتے تو وہاں کی عورتیں اور مرد ہاتھ جوڑ کر حکیم صاحب کی خوشامد کرتے کہ وہ ہماری گلی اور نالی کی صفائی کر کے ہمیں گنہگار اور غضب الٰہی کا حقدار نہ بنائیں۔ چنانچہ وہ زبردستی حکیم صاحب اور دیگر لوگوں سے جھاڑو وغیرہ لے کر خود صفائی کرتے۔ یہ منظر بڑا ہی عجیب ہوتا تھا، جو اخوت انسانی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور دعوتی کام کے لیے راہ ہموار کرتا تھا۔

مولانا شہباز صاحبؒ اور ماسٹر افضال مشہدی صاحبؒ خاص طور پر ہم لوگوں کو مضامین، افسانے اور کہانیاں لکھنے پر ابھارتے۔ مثلاً ''قیامت کے دن سات لوگوں کو عرش الٰہی کے سایے میں جگہ ملے گی''، اس حدیث کے پیش نظر مولانا شہباز صاحب نے فرمایا کہ کوئی طالب علم اس کی روشنی میں ایک افسانہ لکھ دے۔ میں نے پیشکش کی اور ''ریزرویشن'' نام سے ایک افسانہ تحریر کیا، جسے مولانا نے دیکھا اور پھر ''نور''، رامپور میں شائع ہوا۔ اسی طرح متعدد مضامین لکھنے کا ہم کو موقع ملتا۔

کبھی کبھی افسانہ نویسی اور مضمون نویسی کے مقابلے بھی کرائے جاتے۔ ایسے ہی ایک مقابلے میں مجھے بھی حصہ لینے کا موقع ملا۔ میرے افسانہ کو اول انعام ملا۔ بعد میں یہ افسانہ 'کفارہ' کے نام سے ملک اور بیرون ملک کئی رسائل میں شائع ہوا۔ یہ پروگرام جمعیۃ الطلبہ کے معمول کے پروگراموں کے علاوہ ہوتے تھے۔

ہمارے زمانے میں جمعیۃ الطلبہ بہت سرگرم تھی۔ اس پلیٹ فارم کا مقصد طلبہ کے اندر خود اعتمادی اور قائدانہ صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ میں بھی اس کے کئی شعبوں کا معتمد رہا اور آخری دور میں دو سال تک سکریٹری کی ذمہ داری میرے اوپر رہی۔

جمعیۃ الطلبہ کے پروگرام طلبہ کی ہمہ جہتی تربیت میں نہایت مددگار ثابت ہوتے تھے۔ بہت سے طلبہ کی نمایاں صلاحیتیں دیکھنے کو ملتیں۔ جمعیۃ کے ذمہ دار ایسے طلبہ کو مفید مشورے دیتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اس پلیٹ فارم کو فعال رہنا چاہیے۔

ہمارے اساتذہ طلبہ کے ذاتی اور گھریلو مسائل میں بھی ایک سرپرست کی طرح رہنمائی فرماتے۔ اس پہلو سے مجھے ان سے استفادے کا بھرپور موقع ملا۔ ایک بار میری والدہ نے (اس وقت تک وہ مشرف باسلام نہیں ہوئی تھیں) مجھے ایک نہایت جذباتی اور درد سے لبریز خط لکھا۔ میں اس خط کو پڑھ کر پریشان ہوگیا، میری رات کی نیند اڑ گئی اور دن کا سکون جاتا رہا۔ میں والدہ کے اندیشوں کو غلط ثابت کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ دراصل میری والدہ نے اپنے خط میں اس بات کا خدشہ بلکہ یقین ظاہر کیا تھا اور اس پر بڑے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا تھا کہ میرے قبول اسلام کے بعد اب میری اور ان کی جدائی لازمی ہے۔ انہوں نے اپنے خط میں اپنے خاندانی پنڈت جی کی یہ پیشین گوئی بھی اپنی بات کے حق میں تحریر کی تھی کہ بڑا ہوکر آپ کا یہ بیٹا آپ کا نہیں رہے گا، بلکہ کسی اور کا ہوجائے گا۔ ان کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ میں نے اسلام اس کی خوبیوں کی وجہ سے قبول نہیں کیا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسلام میں تو کوئی خوبی سرے سے ہے ہی نہیں۔ بلکہ دراصل مجھے مولانا سید حامد علی صاحبؒ نے بہکا دیا ہے اور میں کسی سازش کا شکار ہوگیا ہوں۔ جبکہ درحقیقت یہ باتیں اور اندیشے سرے سے بالکل بے بنیاد تھے۔ میں نے مولانا شہباز صاحب کو وہ خط دکھایا، اور اس کے جواب میں میرے ذہن

میں جو باتیں تھیں ان کو بیان کیا۔ مولانا نے فوراً جواب تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے رات میں جاگ کر نم آنکھوں کے ساتھ اللہ رب کریم سے دعائیں کرتے ہوئے والدہ کے نام جواب تیار کیا۔ مولانا چونکہ ہندی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے اس لیے انہوں نے اسے پڑھا اور جواب سے بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ میں نے وہ تحریر اپنی والدہ صاحبہ کو بھجوادی۔ میری یہ تحریر ہندی زبان میں تھی اور بالکل ذاتی نوعیت کی تھی۔ میں نے اپنی پیاری ماں کے نام جو کچھ لکھا تھا وہ میرے جذبات اور میرے دل کی دھڑکن اور آواز تھی۔ اس خط میں میں نے نہ صرف ان کے اندیشوں کو غلط ثابت کیا تھا، بلکہ ساتھ ہی انہیں دین اسلام کی طرف بڑی دل سوزی کے ساتھ دعوت بھی دی تھی، کیونکہ میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ میری پیاری ماں کا ٹھکانہ جنت کے علاوہ کہیں اور ہو۔ مولانا شہباز صاحبؒ اور ماسٹر افضال مشہدی صاحبؒ کے مشورے پر اس تحریر کو اردو زبان میں منتقل کر کے ماہنامہ 'الحسنات'، رامپور میں شائع کرادیا گیا۔ بعد میں یہ تحریر ''نومسلم بیٹے کا ماں کے نام خط'' کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں ملک اور بیرون ملک کی مختلف زبانوں میں شائع ہوئی۔ بیرون ملک میں خصوصاً سعودی عرب اور کویت کے کئی دعوتی اداروں نے اسے شائع کیا۔ اب یہ تحریر ''پیاری ماں کے نام اسلام کا پیغام'' کے نام سے شائع ہورہی ہے۔ الحمدللہ! یہ ذاتی خط بہت سی سعید روحوں کی ہدایت کا سبب بنا اور آج بھی بن رہا ہے۔ یہاں اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ہمارے اساتذہ صرف درس وتدریس تک ہی محدود نہ تھے بلکہ طلبہ کے ذاتی مسائل سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ صرف ناصح نہ تھے بلکہ غم گسار اور چارہ ساز بھی تھے۔

جامعہ کے اساتذہ کی کوشش ہوتی کہ جامعہ کے کام خود طلبہ انجام دیں۔ چنانچہ مسجد، میدان اور کمروں کی صفائی، نیز بیت الخلاء کی صفائی وغیرہ امور طلبہ ہی انجام دیتے، نیز وہ باغبانی بھی کرتے۔ خاص بات یہ تھی کہ اساتذہ بھی ان کاموں میں برابر کے شریک ہوتے۔ جامعہ کی عظیم الشان اور نہایت خوبصورت اور پیاری مسجد خصوصاً مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب مدظلہ العالی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ایک بار مولانا علی میاںؒ جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔ جامعہ کی اس مسجد کو دیکھتے ہی مولاناؒ نے فرمایا تھا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس خوبصورت

مسجد کو ندوہ لے جاؤں۔ مولانا اصلاحی صاحب طلبہ کو مسجد کے کاموں کے لیے ابھارتے اور طلبہ بخوشی اس 'کارسیوا' میں شریک ہوتے۔ مسجد میں اینٹیں اور دیگر مٹیریل اکثر و بیشتر طلبہ ہی کے ذریعے پہنچایا جاتا، اس وجہ سے طلبہ کو جامعہ اور اس کی مسجد سے محبت ہونا ایک فطری امر تھا۔

مسجد کی تعمیر کے لیے بڑے سرمایے کی ضرورت تھی۔ مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب ہم طلبہ کو مقامی آبادی اور قرب و جوار کے گاؤں میں چندہ جمع کرنے کے لیے بھیجتے۔ مولانا موصوف نے ایک مختصر سی مگر نہایت مؤثر نظم تحریر فرما کر ہم لوگوں کو یاد کرادی تھی، جسے پڑھ پڑھ کر ہم چندہ وصول کرتے۔ وہاں کے لوگوں کا جذبہ انفاق بھی کیا خوب تھا! ایسا جذبہ مجھے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملا۔ مرد اور خواتین سب دل کھول کر چندہ دیتے۔ کوئی نقد رقم دیتا اور کوئی اپنے زیور۔ یہاں تک کہ لوگوں نے بکریاں، مرغیاں، برتن، نئے کپڑے، بعض نے اپنی سائیکل تک چندے میں دے دی۔ بعد میں ان چیزوں کی سیل (Sale) لگائی گئی۔ بستی کے لوگ بھی چیزیں خریدنے کے لیے آئے۔ ہم طلبہ نے بھی بعض چیزیں خریدیں۔ اس سامان سے حاصل شدہ رقم کو داخل حساب کر دیا گیا۔ یہاں اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ہمارے کئی اساتذہ نے چندے میں ملی مرغیاں خرید کر ہم طلبہ کے حوالے کر دیں اور پھر ہم لوگوں نے خوب دعوتیں کھائیں۔ اسے کہتے ہیں آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

اساتذہ و طلبہ کی کوشش ہوتی کہ جامعہ کے اوپر اخراجات کا کم سے کم بار ڈالا جائے۔ بہت سے ایسے کام جن میں کافی رقم خرچ ہوتی ہے خود کر لیے جائیں۔ جامعہ کے مشرق جنوب میں بیت الخلاء اور غسل خانے تعمیر کیے گئے تھے۔ قریب ہی ایک کافی بڑا سیفٹی ٹینک بنایا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ٹینک بھر گیا اور بند ہو گیا۔ صفائی کرنے والوں کو بلایا گیا۔ انہوں نے اس کی صفائی کے لیے بڑی رقم طلب کی۔ مولانا شہباز اصلاحی صاحب اور مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب نے بڑے طلبہ کو جمع کیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، نیز یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ ہم سب مل کر اس ٹینک کی صفائی کر دیں اور جامعہ کو زیر بار ہونے سے بچالیں۔ طلبہ اس کے لیے بخوشی تیار ہو گئے اور اسی وقت سب لوگ صفائی کے لیے نکل پڑے۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ مولانا شبیر اصلاحی ٹینک میں اترے ہوئے ہیں اور بالٹی بھر بھر کر باہر کھڑے لوگوں کو دے

رہے ہیں ۔مولانا شہباز صاحب بھی اس کام میں شریک ہیں، چند گھنٹوں میں ٹینک کی صفائی ہوگئی اوراس طرح جامعہ کی کافی رقم بچ گئی۔

ذمہ داران کا جامعہ کے کاموں میں طلبہ کوشریک کرنا جہاں ایک طرف قرآن وسنت کی روح کے عین مطابق اور ہمہ جہتی فائدوں کا حامل تھا، وہیں دوسری طرف بے شمار پیش آمدہ مسائل کا حل بھی تھا۔ اس طرح طلبہ ادارے اور معاشرے کی تعمیر وترقی میں اپنی ذمہ داریوں کے تئیں بیداراور فعال رہتے ۔ یہ خوبی اور تربیت ایسی تھی جو ہمیشہ ان کے کام آنے والی تھی۔

طلبہ اساتذہ کا بڑا احترام کرتے اوران کی خدمت کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ اگرکوئی استاذ اپنا لوٹا لے کر پانی لانے کے لیے نکلتے تو کوئی طلبہ ایک ساتھ لپک کران کے ہاتھ سے لوٹا لے لیتے اور پانی بھر کر کمرے میں پہنچادیتے۔طلبہ کے جذبہ خدمت اوراحساس ذمہ داری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب بھی کوئی مہمان یا جامعہ کا کوئی شخص جامعہ پہنچتا تو طلبہ خود سے دوڑ کر جاتے اوراس کا سامان اٹھاتے۔

طالب علم صرف کتابوں ہی سے نہیں سیکھتا بلکہ اپنے معلم اور ماحول سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ تجربے کی بات یہ ہے کہ کسی کتاب کا اثر اتنا زیادہ نہیں پڑتا جتنا اس کو پڑھانے والے استاذ کے اخلاق کا اثر انسان کے دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ اس پہلو سے میں کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی ہمارے اساتذہ ہمارے لیےنمونہ تھے اوران کی اعلیٰ ظرفی، بلند اخلاقی اوران کے ایثاراورقربانی کے جذبے کوکبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔اس کےصرف چندنمونے ملاحظہ کریں:

مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب ہمارے استاذ تھے ۔کسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ مجھ سے سخت ناراض ہوگئے ۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ششماہی امتحان آگیا۔ جامعہ کا قاعدہ تھا کہ جواستاذ جومضمون پڑھاتا اس کا پرچہ وہی بناتا اور وہی امتحان کی کاپی چیک کرتا۔صرف ونحو مولانا موصوف پڑھاتے تھے۔ چنانچہ اس کا پرچہ بھی انہوں نے ہی بنایا تھا اوران کو ہی اس مضمون کی کاپیاں چیک کرنی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ چونکہ مولانا مجھ سے سخت ناراض ہیں اس لیے اس مضمون میں یاتو مجھے فیل کردیا جائے گا یا پھر بہت معمولی نمبروں سے پاس کیا جائے گا۔مگر

ہمارے استاذ کی اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ وہ میرے جوابات سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے اس نالائق شاگرد کو جس سے انہیں کچھ شکایات تھیں 50 میں سے 51 نمبر عنایت فرمائے (اس بات کا چرچا جامعہ میں کئی دنوں تک رہا۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ نے مجھے بلایا اور اپنے مخصوص انداز میں پوچھا، کیا جی! تم نے مصنف سے بھی اچھا لکھ دیا تھا! میں نے عرض کیا، مولانا! مصنف بھی انسان تھے اور میں بھی انسان ہوں، آدمی مصنف سے اچھا لکھ سکتا ہے۔ بہرحال مولانا بہت خوش ہوئے)۔ ایسے بلند اخلاق اور اعلیٰ ظرف اساتذہ سے انسان متأثر کیوں نہ ہوگا، اور ان کی صفات اپنے اندر پیدا کیوں نہیں کرے گا۔ ایسے اساتذہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ایک بار مولانا جلیل احسن ندویؒ نے کسی معمولی بات پر مجھے ڈانٹ دیا۔ اس کی وجہ سے میں بھی دو روز ان سے ملاقات کے لیے نہیں گیا۔ تیسرے دن کسی کے ذریعے مولانا نے مجھے بلایا۔ میں پہنچا تو دیکھتے ہی فرمایا: کیا جی! ذرا سا ڈانٹ دیا تو ناراض ہو گئے۔ چلو ادھر آؤ اور الماری میں سے مٹھائی کا وہ ڈبہ اٹھا کر لاؤ۔ میں نے ڈبہ مولانا کو لا کر دیا، انہوں نے اسے کھولا اور مجھ سے فرمایا کہ یہ اور یہ میرے لیے چھوڑ دو اور بقیہ وہاں بیٹھ کر کھاؤ۔

یوں تو ہمارے اساتذہ کے بے شمار واقعات ہیں، مگر ان میں سے چند کا ذکر مزید کیا جاتا ہے۔

مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم جامعۃ الفلاح میں تعلیم و تربیت کی خدمت دل و جان سے انجام دیتے تھے۔ وہ جامعہ کے صدر بھی رہے۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت فکرمند رہتے اور اس کے لیے ہمیشہ تدابیر سوچا کرتے۔ ایک بار انہوں نے ہماری کلاس کے سبھی طلبہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور مٹھائی سے ان کی تواضع کی۔ سبھی طلبہ فرش پر حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک بڑی سی پلیٹ میں مٹھائی رکھ دی گئی۔ مولانا مرحوم نے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگ مٹھائی کھائیں لیکن آپ میں سے ہر شخص کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ میرے ساتھی کو اس کا زیادہ موقع ملے۔ مطلب یہ کہ ہر شخص یہ کوشش کرے کہ میرا ساتھی زیادہ کھائے اور میں کم۔ عام طور سے لوگ ایسے مواقع پر دوسروں کو ترجیح دینے کے بجائے خود زیادہ سے زیادہ اور سب سے پہلے مستفید ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا نے اس عادت کو ترک

کرانے کے لیے اس عملی تربیت کا نظم کیا۔ مولانا مرحوم اکثر اسی طرح طلبہ کی تربیت فرماتے تھے۔ مولانا کی نصیحت کا وہاں موجود طلبہ پر یہ اثر ہوا کہ کوئی بھی طالب علم مٹھائی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہا تھا، بلکہ چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ پہلے ہاتھ بڑھائیں۔ بہرحال طلبہ نے مٹھائی کھائی اور ساتھ ہی اس نصیحت کو بھی دل ودماغ میں بٹھالیا۔ اس واقعے کو چالیس پینتالیس سال ہوچکے ہیں مگر مولانا مرحوم کی نصیحت آج بھی دل ودماغ میں تازہ ہے کہ کسی تقریب یا دعوت کے موقع پر دسترخوان پر بے صبروں کی طرح ٹوٹ نہیں پڑنا چاہیے، بلکہ سلیقے اور ایثار کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ مولانا کی یہ نصیحت اس وقت اور بھی زیادہ یاد آتی ہے جب یہ منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور دیندار لوگ کسی تقریب کے موقع پر کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور اپنی پلیٹوں میں اس قدر کھانا ایک ہی بار میں نکال لیتے ہیں گویا یہ ان کا پہلا اور آخری موقع ہے۔

جامعہ کی موجودہ مسجد کے مشرق میں ایک کنارے پر چند پرانے قسم کے بیت الخلاء بنے ہوئے تھے، جن کو بعض طلبہ اکثر گندا کردیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ ایک دن فجر سے قبل درمیان رات میں مجھے بیت الخلاء جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اندھیری رات تھی۔ میں جب کچھ آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا سایہ اِدھر سے اُدھر آجا رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا خوف محسوس ہوا۔ ہمت کرکے کچھ آگے بڑھا تو دیکھا کہ کوئی شخص لالٹین کی روشنی میں بیت الخلاء کی صفائی کررہا ہے۔ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ہمارے استاذ گرامی قدر مولانا شہباز اصلاحیؒ ہیں، جو کچھ فاصلے پر لگے ہینڈ پمپ سے بالٹی میں پانی بھرکر لارہے ہیں اور خود ہی بیت الخلاء کی صفائی کررہے ہیں۔ میں نے مولانا کو سلام کیا اور ان سے عرض کیا کہ آپ یہ کیا کررہے ہیں! کل صفائی والا اس کی صفائی کردے گا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے مولانا کے ہاتھ سے بالٹی اور جھاڑو لینے کی کوشش کی مگر مولانا نے مجھے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ صفائی ہوچکی ہے۔ تم اپنی ضرورت سے فارغ ہولواور جاکر سوجاؤ۔

دارالاقامہ میں کچھ چھوٹے بچے بھی تھے جو بسااوقات کپڑے گندے کرلیتے تھے۔ مولانا

شہباز صاحب مرحوم ان بچوں کے کپڑے خود اپنے ہاتھوں سے دھو کر صاف کر دیا کرتے تھے۔ یہ تھے انداز نرالے ہمارے بزرگ اساتذہ کے!

طلبہ ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے خصوصاً بڑے طلبہ اپنے چھوٹے بھائیوں کا۔ کوئی بیمار ہوتا یا اسے کوئی دوسری ضرورت ہوتی تو اسے اکیلے اور بے سہارا ہونے کا کبھی احساس نہ ہونے دیا جاتا۔ بے سہارا اور ضرورت مند ساتھیوں کے تعاون کے لیے بڑے طلبہ نے فیصلہ کیا کہ ضرورت کی چیزوں مثلاً شکر، صابون، تیل، اسٹیشنری وغیرہ کے لیے ایک اسٹور قائم کیا جائے تا کہ اس کی آمدنی سے ضرورت مند طلبہ کا تعاون ہو سکے۔ ابتدا میں بعض سینئر طلبہ نے اپنی طرف سے کچھ رقم اس کام کے لیے پیش کی، اور اس سے تھوڑا تھوڑا سامان خرید کر ایک ٹوکری میں رکھ کر بعد نماز عصر فروخت کرنے لگے، چنانچہ یہ سلسلہ بڑی کامیابی کے ساتھ چلتا رہا اور آگے چل کر اس نے باقاعدہ ایک اسٹور کی شکل اختیار کر لی۔

اپنے اساتذہ سے طلبہ کے والہانہ قلبی لگاؤ کا ایک نمونہ دیکھیے کہ ایک بار مولانا عبد الحسیب اصلاحی صاحب مدظلہ العالی کو ان کے گھر علاؤالدین پٹی میں سانپ نے کاٹ لیا۔ مولانا کو چار پائی پر لٹا کر جامعہ لایا گیا۔ اعظم گڑھ ہسپتال لے جانے کے لیے ٹیکسی کا انتظام کیا گیا۔ مولانا چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ یا بے چینی نہیں تھی۔ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ سب سے مصافحہ کر رہے تھے۔ اپنی غلطیوں کے لیے معافی طلب کر رہے تھے اور اللہ سے مغفرت کی دعا کے لیے درخواست کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹیکسی آ گئی اور مولانا کو اعظم گڑھ ضلع ہسپتال لے جایا گیا۔ ادھر طلبہ جامعہ کی مسجد میں جمع ہو گئے اور اپنے مشفق و محسن استاذ کی صحت کے لیے رو رو کر اور گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے لگے۔ خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ ہر طالب علم اللہ سے گڑ گڑا کر یہ دعا کر رہا تھا کہ پرور دگار! تجھے ہماری جو نیکی بھی پسند آئی ہو اس کے وسیلے میں ہمارے استاذ کو شفا عطا فرما دے۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اللہ رب العزت نے ہماری دعائیں سن لیں اور مولانا شفایاب ہو کر آ گئے۔ اللہ ان کا سایہ ہم پر تا دیر قائم رکھے!

جامعہ کے ہم اور ہمارے خاندان پر اس قدر احسانات ہیں کہ جنہیں نہ تو بھلایا جا سکتا ہے

اور نہ ہی ان کا کماحقہ بدلہ دیا جاسکتا ہے۔ میرے بڑے بھائی نے اپنے دو بچوں اوما کانت اور انل کمار کو ماحول کی خرابی کے سبب میرے ساتھ جامعہ بھیج دیا۔ جامعہ کے ذمہ داران، اساتذہ اور طلبہ نے ان کا تہ دل سے استقبال کیا اور ان بچوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ چند ماہ کے اندر ہی اوما کانت شمیم غازی اور انل کمار وسیم غازی ہوگئے اور ان کے اندر نہایت خوش گوار تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ جب ششماہی تعطیلات میں ہمارے یہ دونوں بھتیجے اپنے وطن گئے تو وہاں کے غیر مسلم مرد وخواتین ان کے اندر خوش نما تبدیلی دیکھ کر بہت متأثر ہوئے اور کئی لوگوں نے تو مجھ سے یہ بھی کہا کہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو آپ کے ساتھ تعلیم کے لیے بھیج دیں۔ اس کے بعد میرے مزید تین بھتیجے (سلیم، عظیم اور نعیم) تعلیم کے لیے جامعہ میں داخل ہوئے۔ وسیم غازی اور نعیم غازی سلمہما نے جامعہ سے فضیلت کی۔

طلبہ کے ساتھ جامعہ کے اساتذہ کا تعلق کتنا جذباتی تھا، اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

بستی کے ایک صاحب نے ان کے پیڑ سے مسواک توڑنے پر ایک طالب علم کو گالی دے دی۔ مولانا جلیل احسن ندوی صاحب کے علم میں جب یہ بات آئی تو انہوں نے ناظم جامعہ جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیجا کہ مجھے گاؤں کے ایک شخص نے گالی دی ہے۔ جب وہ رقعہ ناظم جامعہ کو ملا تو وہ اسے پڑھ کر گھبرا گئے اور فوراً ہانپتے، کانپتے اپنی سائیکل سے جامعہ آئے اور مولانا سے ملاقات کی۔ بڑی گھبراہٹ اور تشویش کی کیفیت کے ساتھ مولانا سے دریافت کیا کہ کس بدبخت نے آپ کے ساتھ گستاخی کی ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ فلاں شخص نے ایک طالب علم کو گالی دی ہے تو گویا اس نے مجھے ہی گالی دی ہے۔

ناظم صاحب نے بلا تاخیر گاؤں میں پنچایت طلب کی اور ان صاحب کو بھی اس میں بلایا گیا۔ ان کی سرزنش کی گئی اور آئندہ بچوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے اور درختوں سے مسواک وغیرہ توڑنے پر انہیں روکنے سے صاف طور پر منع کر دیا گیا۔

ہمارے زمانے میں طلبہ کی تعداد بہت کم تھی، البتہ اس میں ہر سال اضافہ ہو رہا تھا۔ جو شخص بھی جامعہ بغرض تعلیم آتا تھا اس کا مقصد علم دین کا حصول ہی ہوا کرتا تھا۔ جامعہ نے اپنے

مقاصد میں جن امور کا تذکرہ کیا تھا ان میں مسلمانوں کے لیے عام طور پر اور خصوصاً تحریک اسلامی سے وابستہ لوگوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ بطور خاص جامعہ کا یہ مقصد کہ ''ایسے افراد تیار کرنا جو قرآن وسنت کا گہرا علم اور دینی بصیرت رکھتے ہوں۔ جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو اور جو غیر اسلامی افکار ونظریات سے بخوبی واقف ہوں۔ جو اسلامی اخلاق وکردار کے حامل ہوں۔ جن میں احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ ہو۔ جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہوکر وسعت قلب ونظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں''۔ فراغت کے بعد دین کی خدمت ہی طلبہ کا نصب العین ہوتا تھا۔ وہ اس ارادے اور عزم کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے کہ انہیں بھوکے رہ کر بھی دین کی خدمت کرنی ہے۔
اس طرح کے جذبات اساتذہ طلبہ کے اندر پروان بھی چڑھاتے اور اس احساس کو تازہ رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً باہمی ملاقات وگفتگو کی نشست بھی رکھتے۔ اس راہ میں پیش آمدہ پریشانیوں اور تنگ دستیوں کا تذکرہ کرتے اور اپنے اوپر گزرے حالات سے بھی آگاہ کرتے۔ مولانا شہباز اصلاحی صاحب نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ ایک بار ان کے حالات اتنے تنگ ہوگئے کہ مہینوں انہیں گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جب کبھی ان کا دل گوشت کھانے کو کرتا تو وہ گوشت کی دوکان سے مفت چھیچھڑے لے آتے اور انہیں دھوکر ان کا سالن پکا لیتے۔ اس طرح سالن میں گوشت کا کچھ نہ کچھ مزہ آجاتا۔ ان واقعات کو سن کر طلبہ ذہنی طور پر ایسے حالات کے لیے اپنے کو تیار کرتے۔

عربی تعلیم ذریعہ معاش بن سکتی ہے، اس زمانے میں اس کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا۔ نہ تو بیرون ملک کے دروازے کھلے تھے اور نہ ملک میں کسی کالج یا یونیورسٹی سے جامعہ کا کوئی الحاق تھا۔ شروع شروع میں کچھ دنوں تک طلبہ کو گھڑی سازی وغیرہ سکھائی جاتی تھی تاکہ فراغت کے بعد اس طرح کا ہنر کسب معاش کا ذریعہ بن سکے۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک باقی نہیں رہ سکا۔

درجے میں اس بات کا اہتمام کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ اساتذہ اور طلبہ اس سبق کا مطالعہ کرکے آئیں جو پڑھایا جانا ہے۔ اس سے طلبہ کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے میں

بڑی مدد ملتی نیز ان کے اندر خود اعتمادی پروان چڑھتی۔ اگر کوئی استاذ کسی وجہ سے مطالعہ کر کے نہیں آتے تو وہ اس دن طلبہ کو پڑھانے کے بجائے کوئی دوسری گفتگو کرتے۔ عربی سوم سے قرآن مجید کو بھی کورس میں رکھا گیا تھا۔ عربی سوم میں پہنچنے کے بعد جب ہمیں معلوم ہوا کہ اب ہمیں قرآن مجید بھی پڑھنا ہے تو ہمارے دلوں کی عجیب کیفیت تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کوئی اہم کام کرنے جا رہے ہیں۔ ایک طرح کی روحانی مسرت محسوس ہوتی تھی۔ عربی سوم میں قرآن مجید مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب سے پڑھنے کا موقع ملا۔ موصوف دوستانہ انداز اور خوشگوار ماحول میں بے تکلفی کے ساتھ کلاس لیتے اور خود طلبہ کے ذریعے ہی مقامات حل کراتے۔ قرآن مجید کوئی درسی کتاب نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی ایک دو سورتیں بھی مطلوبہ اصولوں کے ساتھ پڑھ لی جائیں تو گویا آدمی پورا قرآن خود سے پڑھ سکتا ہے۔ اس کا نمونہ سبحانی صاحب کے یہاں ملتا تھا۔ ان سے قرآن پڑھنے کے بعد آج بھی وہ انداز اور طریقہ ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے اور آج بھی وہ دوران مطالعہ قرآن معاون و مددگار ہے۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ سے آخری درجوں میں قرآن پڑھنے کا موقع نصیب ہوا۔ ان کا انداز تدریس جداگانہ تھا۔ وہ دوران تدریس تقابل کے لیے مختلف تراجم وتفاسیر بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ کسی آیت کے سلسلے میں دوران تدریس مولانا مودودیؒ یا مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو خط لکھواتے اور اس آیت کے سلسلے میں ان کی رائے دریافت کرتے۔ اگر کوئی جنسی یا اس قبیل کا کوئی موضوع زیر بحث آجاتا تو مولانا طلبہ سے عربی زبان میں گفتگو کرتے۔ اس میں پردہ داری کی شان پیدا ہو جاتی۔ مولانا ندویؒ بھی کلاس کے ماحول کو طلبہ کے لحاظ سے بڑا خوش گوار رکھتے۔ یوں تو مولانا بڑے بارعب اور دبدبے والے شخص تھے لیکن ان کے مزاج میں خشکی بالکل نہیں تھی۔ ایک بار ہمارے کلاس کے ایک ساتھی نے مولانا ندویؒ سے دریافت کیا کہ مولانا، کیا سجدے میں 'سبحان ربی الاعلیٰ' کے بجائے کوئی دوسری دعا پڑھ سکتے ہیں۔ مولانا نے برجستہ جواب دیا، ہاں کیوں نہیں! آپ یہ دعا بھی پڑھ سکتے ہیں کہ اَللّٰهُمَّ زَوِّجْنِیْ (اے اللہ! میری شادی کرادے!) اس پر کلاس کا جو ماحول بنا اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اساتذہ کا احترام بھی ہے۔ ان کی خدمت بھی ہے اور ان سے قربت بھی ہے۔

اس زمانے میں نہایت جلیل القدر اور لائق اساتذہ جامعہ کو میسر تھے۔ جن میں مولانا جلیل احسن ندوی صاحبؒ، مولانا شہباز اصلاحی صاحبؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب، مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحبؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحبؒ اور مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب قابل ذکر ہیں۔ انگریزی کی تعلیم کے لیے ماسٹر افضال مشہدی صاحب اور معاشیات وسیاسیات کے لیے ماسٹر مناظر احسن صاحب کی خدمات حاصل تھیں۔ بعد میں مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب بھی آ گئے، جو استاذ کے ساتھ ساتھ بہترین دوست بھی تھے۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ جونیئر اساتذہ سینئر اساتذہ سے استفادہ کرنے میں کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح بہت سے جونیئر طلبہ اپنے سینئرس سے استفادہ کرتے۔ یہ باتیں سب لوگوں کے علم میں تھیں، اس کی وجہ سے سیکھنے سکھانے کا ایک عام ماحول تھا۔

جامعہ کے تعلیمی وتربیتی نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی طرف پوری توجہ تھی۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سلسلے میں جتنی زیادہ فکرمندی جامعہ میں پائی گئی شاید کہیں دوسری جگہ دیکھنے کو نہ ملے۔

طلبہ کو اس بات کا پابند کیا جاتا تھا کہ وہ جامعہ کے کیمپس ہی میں رہیں۔ اگر کسی ضرورت سے بازار جانا ہوتا تو طلبہ کو اپنے نگراں سے اجازت لینی ہوتی۔ البتہ بعد نماز فجر اور بعد نماز عصر طلبہ کو اس بات کی آزادی تھی کہ وہ کچھ تفریح اور چہل قدمی کے لیے جامعہ سے باہر کھلی جگہ پر جا سکتے تھے۔

اساتذہ کے اندر احساس ذمہ داری نمایاں نظر آتا اور وہ ٹیم ورک کے ساتھ خدمت انجام دیتے۔ یوں بعض لوگوں کو ذمہ داروں سے اختلاف بھی ہوتا مگر جب ان سے جامعہ کے کسی کام کے لیے کہا جاتا تو نہایت دلجمعی اور ذوق وشوق کے ساتھ خدمت انجام دیتے۔ ثانوی کے ایک استاذ ماسٹر جنید احمد صاحب کو صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب سے اکثر شکایات رہتیں، یہ بات سب جانتے تھے۔ ایک روز ماسٹر جنید صاحب نے کہا کہ مولانا جب بھی مجھ سے کسی کام کے لیے کہتے ہیں انکار نہیں ہوتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اختلافات کے باوجود ایک

دوسرے کا احترام اور جامعہ کی خدمت کا جذبہ بھی ہر ایک کے دل میں تھا۔

رائے کے اختلاف کے باوجود فیصلوں کا احترام کیا جاتا۔ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ طوالت سے بچتے ہوئے صرف ایک واقعے کی طرف اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔

ایک بار ایک طالب علم کا اس کی بعض ناپسندیدہ حرکتوں کی وجہ سے ذمہ داران جامعہ نے جامعہ سے اخراج کر دیا، اور اس کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا گیا۔ اس طالب علم کے سرپرست اس وقت کے ناظم جامعہ مولانا جلیل احسن ندویؒ سے ملے اور ان کو اخراج واپس لینے پر آمادہ کرلیا۔ چنانچہ مولانا نے صدر جامعہ مولانا شہباز اصلاحی صاحبؒ کو اس فیصلے کی اطلاع بھجوادی اور صدر جامعہ نے اس لڑکے کو باعزت طریقے پر واپس لے لیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صدر جامعہ مولانا شہباز صاحب اس واپسی کے سخت خلاف تھے اور ان سے اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس فیصلے سے طلبہ کے اندر بھی بے چینی پائی جاتی تھی۔ ایسے مواقع انتشار اور بدنظمی کا سبب بن جایا کرتے ہیں، اور شیطان اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خوب گل کھلاتا ہے۔ اس نازک صورتحال میں صدر جامعہ نے طلبہ کو مسجد میں جمع کیا اور نہایت وقار اور متانت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ فلاں طالب علم کا بعض وجوہ سے اخراج کر دیا گیا تھا، مگر بعد میں اس کے مسئلے پر مزید غور کیا گیا اور اس کے نتیجے میں اس کا اخراج واپس لے لیا گیا۔ صدر جامعہ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم اس طالب علم اور آپ سب سے اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ واضح رہے کہ اس مجلس میں وہ طالب علم بھی موجود تھا۔ مولانا شہباز صاحب نے اپنے اس کردار سے جامعہ کو انتشار سے بچالیا۔

جامعہ کی ایک خصوصیت یہ تھی اور اسے جامعہ کا طرہ امتیاز کہا جاسکتا ہے کہ یہاں فقہی مسالک کے سلسلے میں بڑی کشادہ دلی پائی جاتی تھی۔ اہل حدیث حضرات اور مسلک حنفی کے ماننے والے دونوں موجود تھے، مگر کبھی ان لوگوں کے درمیان کشمکش اور کھینچا تانی نیز بے مطلب کا بحث ومباحثہ دیکھنے کو نہ ملتا۔ مسلکی اختلافات کو ان کے حدود میں رکھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے طلبہ کے اندر کشادہ دلی اور تحمل وبرداشت کی صفت پیدا ہوتی اور طلبہ اپنے اصل مقصد اور نصب العین سے ہٹنے نہ پاتے۔ فارغین جامعہ میں یہ خصوصیت آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ

دراصل جامعہ کے ماحول کا ہی اثر ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر دینی وملی پہلوؤں سے پائے جانے والے نظریات کو بھی ان کے حدود میں رکھا جاتا۔ جمعیۃ الطلبہ کے پروگراموں میں مختلف نظریات پر مباحثہ کرایا جاتا اور کوشش کی جاتی کہ حقائق پر مبنی گفتگو ہو اور کسی طرح کا تعصب در نہ آئے۔ اس کی ایک نمایاں مثال پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مولانا منظور نعمانی مرحوم کی تحریریں مولانا مودودیؒ اور جماعت کے خلاف مسلسل آرہی تھیں۔ جامعہ کے اساتذہ ان کا تجزیہ تو ضرور کرتے لیکن مولانا نعمانی کے خلاف کوئی نامناسب بات نہ کرتے۔ اس کے برخلاف ان کی چیزوں سے استفادہ جاری رکھتے۔ مثلاً بعد نماز عصر جامعہ کی مسجد میں چند منٹ کی جو تذکیر ہوتی، اس میں مولانا نعمانی کی کتاب 'معارف الحدیث' پڑھ کر سنائی جاتی اور کہیں سے کوئی آواز اس کے خلاف سنائی نہ دیتی۔

مختلف نظریات کی حامل شخصیات جامعہ آتیں تو ان سے استفادے کی پوری کوشش کی جاتی۔ اس کشادہ ظرفی اور کھلے ماحول کو دیکھ کر وہ حضرات بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔

ذمہ داران تعلیم وتربیت کی خواہش بلکہ ان کا عمل اس پر تھا کہ خصوصاً سینئر طلبہ سے جامعہ کے نظم وانصرام اور تعلیم وتربیت میں تعاون لیا جائے۔ چنانچہ اس کے مثبت اثرات واضح طور پر سامنے آتے۔ طلبہ واساتذہ ایک فیملی کے افراد نظر آتے۔ اور طلبہ جامعہ کی خدمت کے لیے ہر آن تیار رہتے۔ جامعہ کے طلبہ کے لیے ریلوے ٹکٹ میں رعایت کا مسئلہ سامنے آیا تو ہماری کلاس کے ایک ساتھی عبدالہادی صاحب نے مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کے ساتھ پورا تعاون کیا اور ان کے ہمراہ بنارس جاکر اپنے ایک عزیز جو ریلوے میں ملازم تھے ان کے تعاون سے طلبہ کے لیے رعایت حاصل کرلی جو ہنوز جاری ہے، الحمدللہ!

طلبہ دسترخوان پر اجتماعی طور پر ناشتہ اور کھانا کھاتے۔ کھلانے والے بھی طلبہ ہی تھے۔ ان کی باریاں مقرر ہوتیں۔ اس نظام کے یقیناً کئی فائدے تھے۔ مثلاً طلبہ کے اندر اجتماعیت کا ذوق پیدا ہوتا نیز ان کے اندر نظم وانصرام چلانے کی صلاحیت پیدا ہوتی، مگر ہماری خواہش ہوتی کہ کاش کھانا کمرے ہی میں آجایا کرے۔ اس لیے کہ کھانے کے انتظار اور مطبخ آنے جانے

میں خاصا وقت صرف ہوجاتا تھا۔ مغرب تا عشاء کا قیمتی وقت عام طور پر کھانے کی نذر ہوجاتا۔ اسی طرح صبح ناشتے میں قیمتی وقت صرف ہوجاتا، وہ بھی صرف چنے کے چند دانوں کے لیے۔ اس سے مطالعے کی یکسوئی بھی متأثر ہوتی۔ اب تو کھانا کمروں میں آنے لگا ہے۔

مستطیع طلبہ سے کھانے کے پیسے لیے جاتے تھے، مگر غیر مستطیع طلبہ کا نصف یا پورا وظیفہ جامعہ کی طرف سے ملتا تھا۔ قابل ذکر اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ جن طلبہ کو کھانے کا وظیفہ ملتا تھا ان کی پردہ داری ہوتی تھی تاکہ ان کی خودداری مجروح نہ ہو۔

جب کسی نئے طالب علم کا داخلہ ہوتا تو سینئر طلبہ اس سے آگے بڑھ کر دوستی اور اپنائیت کا ہاتھ بڑھاتے۔ اس کا ہر ممکن تعاون کرتے۔ اس سے بہت سے فائدے سامنے آتے۔ کئی نئے طلبہ کو جامعہ آنے کے بعد اپنے گھر کی یاد ستاتی اور وہ پریشان ہوجاتے۔ سینئر طلبہ کی ان کے ساتھ ہمدردی اور اپنائیت کے سبب وہ اپنے گھر کو بھول جاتے۔ کئی طلبہ طرح طرح کے مسائل بھی پیدا کرتے اور جامعہ کے ماحول کو پراگندہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن اچھی بات یہ تھی کہ ایسے افراد کو راستے پر لانے یا جامعہ کو ان سے نجات دلانے کے لیے خود طلبہ ہی اہم رول ادا کرتے۔ اس وقت کوئی طلبہ تنظیم جامعہ میں سرگرم نہ تھی، بس جامعہ کی قائم کردہ جمعیۃ الطلبہ موجود تھی۔

ہمارے زمانے میں جامعہ کی مجلس شوری کا نام مجلس انتظامیہ تھا۔ اس میں اساتذہ کے علاوہ بستی کے لوگ اور بعض دوسرے مقامات کے حضرات بھی شامل تھے۔ ان ممبران کے درمیان بہت سے مسائل میں کافی اختلافات بھی موجود تھے۔ لیکن ایک خاص بات جو ہم نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان ممبران میں جامعہ کی خدمت کا جذبہ جنون کی حد تک پایا جاتا تھا۔ جس ممبر کو جامعہ کی جو خدمت دی جاتی، وہ اسے سعادت سمجھ کر انجام دیتا تھا۔

مقامی بستی بلریا گنج اور قرب وجوار کی آبادیوں کے لوگ جامعہ کو اپنے لیے باعث سعادت اور باعث خیر وبرکت سمجھتے تھے اور جامعہ کی ہر خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف جامعہ کے اساتذہ کا احترام کرتے بلکہ اس کے طلبہ کو بھی عزیز رکھتے۔ جامعہ کی بقا، استحکام اور ترقی میں ان لوگوں کی خدمات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جامعہ کے ذریعے

جو بھی کارِ خیر انجام پایا ہے اور آئندہ پائے گا، ان شاء اللہ وہ ان لوگوں کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوگا۔

تعلیم و تربیت پر غور و خوض کے نتیجے میں ہمارے بیچ کا فضیلت میں ایک سال کا مزید اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اس پر ہم لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ ہمیں ایک سال مزید رہنے کا موقع ملا۔

جب جامعہ کے حالات و کوائف پر سوچنے اور غور و فکر کرنے بیٹھتے ہیں تو پرت در پرت باتیں سامنے آتی جاتی ہیں، جن کا تذکرہ یقیناً ضروری اور مفید ہو سکتا ہے مگر مزید تفصیلات کا اس وقت موقع نہیں ہے۔

اس بات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے جامعہ میں سب کچھ اچھا ہی اچھا ہو، ایسا بالکل نہیں تھا۔ اس زمانے میں بھی مختلف پہلوؤں سے بہت سی خامیاں اور کمزوریاں موجود تھیں، مگر ان کو دور کرنے کی فکر اور کوشش وابستگان جامعہ کے اندر کبھی سرد نہیں پڑی۔ اور ہاں! طلبہ نے ان کی وجہ سے نہ تو اپنی تعلیم و تربیت کو متأثر ہونے دیا اور نہ جامعہ سے تعلق خاطر کو کمزور پڑنے دیا۔

آخر میں اس حقیقت کو بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جامعۃ الفلاح اپنے عظیم اور بلند اغراض و مقاصد اور اپنی گراں قدر خدمات کی وجہ سے ملک و ملت اور تحریک اسلامی کا عظیم سرمایہ ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت، استحکام و ترقی ہم سب کی مشترک ذمہ داری ہے۔ ہماری یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اس کو کسی پہلو سے بھی کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔

☆☆☆